شرک فی الصفات

الحمدللہ ہم نے اقسامِ شرک کے حوالے سے شرک کی پہلی قسم ''شرک فی الذات'' کی کسی حد تک تفہیم حاصل کر لی ہے۔ اب ہم اللہ کی توفیق سے شرک کی دوسری قسم ''شرک فی الصفات'' کی بحث کا آغاز کرتے ہیں۔ شرک فی الصفات کے بارے میں ابتدائی طور پر یہ جان لیجیے کہ یہ مسئلہ ذرا باریک اور علمی نوعیت کا ہے اور اس میں پاؤں کے پھسل جانے کا بڑی آسانی سے احتمال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری زبان کی تنگ دامانی کے باعث صفات (Adjectives and attributes) کے طور پر جو الفاظ ہم استعمال کرتے ہیں وہ خالق اور مخلوق کے مابین مشترک ہیں۔ یعنی وہی الفاظ ہم اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال کرتے ہیں اور وہی مخلوق کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جیسے ہم کہتے ہیں کائنات بھی موجود، خدا بھی موجود، میں بھی موجود، آپ بھی موجود۔ اس طرح ایک وصف ''وجود'' مشترک ہو گیا اللہ تعالیٰ میں، اس کائنات میں، مجھ میں اور آپ میں۔ اسی طرح صفت ''حیات'' مشترک ہے اللہ اور مخلوق کے مابین۔ اللہ تعالیٰ بھی زندہ، ہم بھی زندہ، یہ چوپائے وغیرہ بھی زندہ۔ لفظ ''علم'' کا استعمال اللہ کے لیے بھی ہے ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ اور بندوں کے لیے بھی، بلکہ انسانوں میں ''عَــلّامة'' بھی ہوتے ہیں جو صفتِ علم کا مبالغے کا صیغہ ہے۔ لفظ ''ارادہ'' بندوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے کہ ''میرا یہ ارادہ ہے'' اور اللہ کے لیے بھی کہ ﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٨٢﴾﴾ (یٰسٓ)۔ اسی طرح لفظ ''مشیت'' مشترک ہے اللہ اور مخلوق کے مابین۔ جیسے کسی صحابیٔ رسولؐ کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے: ''مَاشَاءَ اللّٰهُ وَمَا شِئْتَ'' (جو اللہ کی مشیت اور جو آپ کی مشیت) تو نبی اکرم ﷺ نے اُن کو سختی سے ٹوک دیا، اس لیے کہ اس سے شرک کا شائبہ جنم لے سکتا تھا، حالانکہ ان صحابیٔ رسولؐ کی نیت میں، معاذ اللہ، کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ تو صفات کے لیے جتنے الفاظ مستعمل ہیں وہ سب مشترک ہیں خالق اور مخلوق کے مابین۔ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی مستعمل ہیں اور مخلوقات کے لیے بھی، اور اسی سے فساد اور غلطی کا سارا احتمال پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ جب اِن الفاظ کا استعمال اللہ کے لیے ہوتا ہے تو ان کا مفہوم بالکل مختلف ہے اُس مفہوم سے کہ جس مفہوم میں ان الفاظ کا استعمال مخلوقات کے لیے ہوتا ہے۔ لفظ مشترک ہے جبکہ مفہوم جدا ہے۔

شرک فی الصفات سے بچاؤ کا فارمولا

اب یہ سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ اور انسانوں کی صفات الفاظ مشترک ہونے کے باوجود مفہوم و معنی میں کس طرح جدا ہیں۔ تین چیزیں اگر مدِّنظر نہ رہیں اور ذہن میں متحضر نہ رہیں تو شرک کا بلاارادہ اور بلاشعور احتمال پیدا ہو جائے گا۔ پہلی چیز یہ کہ اللہ تعالیٰ کا وجود بھی قدیم ہے اور اس کی صفات بھی قدیم ہیں، جبکہ ماسویٰ اللہ (جملہ مخلوقات) کا وجود بھی حادث ہے اور صفات بھی حادث ہیں۔ جو بڑے سے بڑے مشرک گزرے ہیں خدا کو تو انہوں نے بھی قدیم مانا ہے۔ ''تعدّدِ قدماء'' کا نظریہ رکھنے والوں کا عقیدہ تھا کہ اللہ بھی قدیم، روح بھی قدیم اور مادہ بھی قدیم۔ کچھ لوگوں نے ذرا رعایت کرتے ہوئے دو ہستیوں کو قدیم مانا ہے کہ خدا بھی قدیم اور مادہ بھی قدیم، جبکہ توحید یہ ہے کہ قدیم ہستی صرف اللہ کی ہے، باقی سب کو حدوث لاحق ہے کہ پہلے نہیں تھے، پھر ہو گئے۔

دوسری چیز یہ کہ اللہ کا وجود بھی ذاتی ہے اور صفات بھی ذاتی ہیں، جبکہ ماسویٰ اللہ کا وجود بھی عطائی ہے اور صفات بھی عطائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو ازخود ہے، خود بخود ہے۔ کوئی اور تو اسے وجود دینے والا نہیں، معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ۔ اسی طرح اس کی صفات بھی ذاتی ہیں، کسی اور کی عطا کردہ نہیں، اس کو علم کسی اور نے نہیں دیا، معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ۔ جبکہ جملہ مخلوقات کا وجود بھی عطائی ہے، اللہ نے ہی سب کو وجود عطا کیا ہے۔ بقول شاعر: ؎

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

تو یہ قضا اور حیات تو بس ارادۂ خداوندی ہے، فیصلۂ خداوندی ہے، امرِ خداوندی ہے۔ اُس نے چاہا تو ہم ہو گئے۔ اسی طرح جملہ مخلوقات کی صفات بھی عطائی ہیں، ذاتی نہیں ہیں، اللہ نے عطا کی ہیں۔

تیسری چیز یہ کہ اللہ کی ذات بھی مطلق ہے اور صفات بھی مطلق ہیں، جبکہ ماسویٰ اللہ (جملہ مخلوقات) کا وجود بھی محدود ہے اور صفات بھی محدود ہیں۔ مطلق عربی زبان میں ''ط، ل، ق'' مادے سے ہے جس کا مطلب ہے آزادی، بے قید ہونا، لامتناہی ہونا، حدود اور نہایت سے مبرّا ہونا۔ ''طلاق'' کا مطلب یہی ہے کہ عورت کو نکاح کے بندھن سے آزاد کر دیا جائے۔ تو اللہ تعالیٰ کا وجود اور صفات مطلق، لامتناہی، حدود و قیود اور انتہا سے مبرّا ہیں۔ انگریزی میں اللہ تعالیٰ کو کہا جاتا ہے: ''The Absolute Being''۔ ہم اللہ تعالیٰ کی صفات کے بیان کے لیے ایک ہی لفظ ''کُل'' کے دامن میں پناہ لیتے ہیں کہ: ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿﴾﴾ ''وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے'' اور: ﴿وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿﴾﴾ ''وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے''۔

اس حوالے سے جان لیجیے کہ جب بھی کوئی لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے بطور وصف یا صفت بولا جائے تو مذکورہ بالا تین تصورات ذہن میں مستحضر رہیں کہ (۱) اللہ تعالیٰ کی وہ صفت یا وصف قدیم ہے' اس میں حدوث کا کوئی شائبہ نہیں۔ (۲) وہ ذاتی ہے' کسی کا عطا کردہ نہیں۔ اور (۳) وہ مطلق اور لامتناہی ہے' اس میں کہیں کوئی حدّ و نہایت نہیں۔ اس کے بالکل برعکس جب وہی لفظ ہم مخلوقات میں سے کسی کے لیے بطور صفت یا وصف بولیں گے تو وہاں یہ تین تصورات ملحوظ رہیں گے کہ جیسے وہ چیز خود حادث ہے ویسے ہی اس کی وہ صفت بھی حادث ہے' جیسے اس کا وجود عطائی ویسے ہی اس کی صفت بھی عطائی ہے اور جیسے اس کا وجود محدود ہے ویسے ہی اس کی صفت بھی محدود ہے۔ تو یہ تینوں تصورات اگر ہر وقت مدّنظر رہیں تو صفات کے معاملے میں آدمی شرک میں ملوث نہیں ہوگا۔ لیکن اگر ان میں سے کسی میں بھی ٹھوکر کھا گئے تو ''شرک فی الصفات'' کا راستہ کھل جائے گا۔ یہ الجبرے کے فارمولے کی طرح بالکل واضح بات ہے۔ اس کو سمجھ لیا جائے تو بڑے بڑے مسائل اور عقدے حل ہوتے چلے جائیں گے۔ یہ گویا وہ کلید ہے کہ جس سے ہمارے ہاں عقائد کی بحثوں کے جو بڑے بڑے تالے پڑے ہوئے ہیں وہ کھلتے چلے جائیں گے۔

دورِ جدید کا سب سے بڑا شرک

اب جو اِس دَور کا سب سے بڑا شرک ہے پہلے اسے سمجھ لیا جائے' جس کے بارے میں مَیں اپنے بارے میں بھی نہیں کہہ سکتا کہ میں اس سے بالکل بری ہوں۔ اللہ ہی جس کو بچا لے وہ بچ جائے گا' ورنہ اللہ کی توفیق کے بغیر اس سے بچنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ وہ شرک کیا ہے؟ وہ ''مادّہ پرستی کا شرک'' ہے۔ اصل میں ایک نظریہ' ایک خیال اور ایک مغالطہ دنیا میں رہا تو ہمیشہ سے ہے' لیکن اِس دَور میں آ کر اس نے ایک فلسفہ' فکرِ انسانی کے لیے ایک بہت بڑے محور اور مرکز کی حیثیت اختیار کر لی ہے' اور وہ یہ ہے کہ مادہ کی صفات (Properties of the matter) مستقل ہیں' دائم ہیں' غیر متبدل (immutable) ہیں' ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی' یہ صفات مادے سے منفک نہیں ہوسکتیں اور قوانین طبیعی (Laws of the Nature) کبھی تبدیل نہیں ہوتے۔ جب سے سائنس کا دَور دورہ' شُہرہ اور غلغلہ ہوا ہے اور جب سے ذہنوں پر اس کی چھاپ بہت گہری ہوگئی ہے اور سائنسی اکتشافات نے انسان کو مبہوت اور مرعوب کر دیا ہے تب سے یہ فکر ہمارے ذہنوں میں پیوست ہوگیا ہے کہ مادے کی صفات مستقل ہیں' دائم ہیں' ہمیشہ بروئے کار آتی ہیں' کوئی صورت نہیں ہے کہ مادے سے اس کی صفت منفک ہو جائے' بلکہ وہ اپنی جگہ مستقل بالذات ہے۔ گویا کہ ہم نے آج مادے کو اُس مقام پر بٹھا دیا ہے جہاں اصلاً اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ صفات تو اللہ تعالیٰ کی مستقل اور دائم ہیں' قانون تو اس کا ہے جو کبھی نہیں بدلتا۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنے بچے کو وصیت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ: لَا فَاعِلَ فِی الْحَقِیْقَةِ وَلَا مُؤَثِّرَ اِلَّا اللّٰہُ'' فاعلِ حقیقی اور مؤثرِ حقیقی اللہ کے سوا کوئی نہیں''۔ جیسے حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہے تھے: ﴿یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ ط اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾﴾ ''اے میرے بچے! اللہ کے ساتھ شرک نہ کیجیو! یقیناً شرک بہت بڑا ظلم (اور بہت بڑی ناانصافی) ہے۔''

اصل حقیقت یہ ہے کہ آگ میں جلانے کی تاثیر ہے' لیکن یہ اس کی ذاتی نہیں ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ ہے اور اُسی وقت بروئے کار آئے گی جب اللہ چاہے گا۔ آگ کو جلانے کی صفت ودیعت کرنے کے بعد' معاذ اللہ' اللہ کے ہاتھ بندھ نہیں گئے کہ مَیں تو آگ میں جلانے کی صفت پیدا کر چکا' بدبختوں نے ابراہیم علیہ السلام کو اٹھا کر آگ میں پھینک دیا ہے تو اب میں کیا کروں! معاذ اللہ۔ آگ کا وصف ذاتی اور مستقل نہیں' بلکہ اللہ کے اِذن کے تابع ہے۔ آگ اُسی وقت جلائے گی جب اللہ کا اِذن ہوگا' اگر نہیں ہوگا تو نہیں جلائے گی۔ لہٰذا تمام صفاتِ مادہ تابع ہیں مشیتِ خداوندی کے' یہ مستقل بالذات نہیں ہیں۔ نیوٹونین فزکس یعنی جو فزکس کا ابتدائی دَور تھا' اس میں بڑا اِذعان اور بڑا یقین تھا کہ جو قوانین ہم نے دریافت کر لیے ہیں یہ حتمی ہیں' ان میں کسی تبدیلی کا امکان ہی نہیں ہے۔

"We have discovered the final truth."

اور ''قانون بقائے مادہ'' کی رو سے مادہ لازوال اور غیر فانی ہے:

(Matter is indestructible.)

اور matter اور energy دو جدا کیٹیگریز ہیں۔ یہ نیوٹن کی فزکس کے مبادیات تھے۔ ان کا جب ہمارے عقائد' مذہبی فکر اور ایمانی نظریات کے ساتھ تصادم ہوا تو اس کا پہلا مظہر یہ سامنے آیا کہ اب معجزات کی کیا تعبیر و تاویل کی جائے! مغربی فکر اور استعمار کا یہ ریلا اتنا شدید تھا کہ بیچارے سر سید احمد خان جیسا مخلص مسلمان بھی ثابت قدم نہ رہ سکا اور اس سیلاب کی رو میں بہہ گیا۔

اُس وقت ایک طرف مغربی تہذیب' مغربی استعمار اور مغربی قوت تھی' ان کی فوجیں آ رہی تھیں۔ اور دوسری طرف اُن کا فکر آ رہا تھا' سائنس بڑے زور و شور کے ساتھ آ رہی تھی تو اس سیلاب کے آگے کھڑے رہنا آسان نہیں تھا' لہٰذا بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے اور انہوں نے قرآنی تعلیمات کو مغربی فکر کے سانچے میں ڈھالنے اور اس کے موافق بنانے کی کوشش کی۔ اُن کے لیے یہ مشکل پیدا ہوئی کہ پانی تو اپنی سطح برقرار رکھتا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ عصاءِ موسیٰ کی ضرب سے سمندر کا پانی پھٹ گیا؟ سر سید کے فکر کی ترجمانی کی جائے تو وہ یہ ہوگی کہ یہ تو بڑی مصیبت ہے کہ قرآن میں ایسی ہلکی بات آ گئی' اب ہم دنیا کو کیا مُنہ دکھائیں؟ ہمارے لیے تو اِس سائنسی دَور میں لوگوں سے آنکھیں چار کرنا ممکن نہیں رہا۔ لہٰذا اس کی کوئی ایسی

تأویل اور تعبیر کرو کہ مذہب اپنی جگہ قائم رہ جائے اور سائنس اپنی جگہ قائم رہ جائے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ اصل میں یہ تو مدّ و جزر کی بات تھی جسے مولویوں نے سمجھا نہیں اور اسے خواہ مخواہ ایک عجوبہ اور معجزہ قرار دے دیا اور ایک افسانہ بنا لیا۔ جوار بھاٹا سمندر میں آتا ہی رہتا ہے۔ کبھی سمندر recede کر جاتا ہے' پیچھے کو ہٹ جاتا ہے اور خشکی نکل آتی ہے' کبھی سمندر چڑھاؤ پر آتا ہے تو پانی ہی پانی ہو جاتا ہے۔ اصل میں سمندر اُس وقت جزر پر تھا جبکہ موسٰی علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر نکل گئے' اور جب فرعون اپنے لشکر سمیت گزرنے لگا تو اُس وقت سمندر مدّ پر آ گیا' لہٰذا فرعون لشکر سمیت ڈوب گیا۔ یہ تأویل درحقیقت سرسید کی اس سوچ کی عکاسی کرتی ہے کہ وہ سائنسی فکر' اس کے رعب و دبدبے اور جاہ و جلال کے مقابلے میں اپنے تئیں اسلام کا دفاع کر رہے تھے۔ اس حوالے سے سرسید ہمدردی کے مستحق ہیں۔ یہ درحقیقت اس مغربی فکر کا پہلا حملہ تھا جو ہم پر ہوا' جس کے نتیجے میں معجزات کا انکار ہوا اور ہر چیز کی تأویل کرنے کی کوشش کی گئی۔ انسان کے ذہن میں جب کوئی فکر راسخ ہو جاتا ہے تو بڑی بڑی حقیقتیں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں' وہ گویا اندھا ہو جاتا ہے اور راستے کے بڑے بڑے پتھر اسے نظر نہیں آتے۔ اور ایسا بڑے بڑوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ سرسید احمد خان پر جب یہ فکر مسلط ہو گیا تو انہیں قرآن میں یہ الفاظ نظر نہیں آئے: ﴿فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿٦٣﴾﴾ (الشُّعراء) ''پس سمندر پھٹ گیا تو اس کا ہر ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہو گیا''۔ اِنْفَلَقَ يَنْفَلِقُ کا مطلب ہے پھٹ جانا۔ اللہ تعالیٰ کے لیے قرآن مجید میں ''فَالِقُ الْاِصْبَاحِ '' (رات کی تاریکی کا پردہ پھاڑنے والا) اور ''فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی '' (دانے اور گٹھلی کا پھاڑنے والا) کے الفاظ آئے ہیں۔ تو یہاں فَانْفَلَقَ کا ترجمہ مدّ و جزر کسی صورت میں نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح مذکورہ بالا آیت کے اگلے الفاظ ہیں: ﴿فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿٦٣﴾﴾ ''تو (سمندر کا) ہر ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہو گیا''۔ اب ان الفاظ سے مدّ و جزر مراد ہونے کا تو کوئی امکان ہی نہیں' اس کی اس فطری مظہر (مدّ و جزر) کے ساتھ سرے سے کوئی مناسبت نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ جب کوئی فکر کسی سبب سے انسان کے ذہن کے اوپر اس طرح مستولی ہو جاتا ہے تو بڑی بڑی حقیقتیں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں اور بعینہٖ یہی معاملہ سرسید احمد کے ساتھ پیش آیا۔ اور صرف انہی کے ساتھ نہیں' اور بھی کئی بڑے بڑوں کے ساتھ یہی معاملہ ہوا ہے۔

میں یہاں ایک مثال مولانا ثناء اللہ امرتسری کی دیتا ہوں۔ وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے' پکے اہلحدیث تھے' اسلامی روایات' قرآن مجید اور حدیث کو تھامنے والے تھے۔ لیکن وہ دَور ہی ایسا تھا کہ ایک جگہ اُن کے قدم بھی پھسل گئے۔ سورۃ البقرۃ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ مکالمہ نقل ہوا ہے کہ ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی: ﴿رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ط﴾ ''اے میرے پروردگار! مجھے دکھا دے تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے!'' اللہ تعالیٰ نے فوراً سوال کیا: ﴿اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ط﴾ ''کیا تم ایمان نہیں رکھتے؟'' اس پر ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا: ﴿بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ط﴾ ''کیوں نہیں (میں یقیناً ایمان رکھتا ہوں) لیکن ذرا مزید اطمینانِ قلبی درکار ہے۔'' اس کے بعد حکم دیا گیا: ﴿فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ﴾ ''تو چار پرندے لے لو اور انہیں اپنے سے ہلا لو (مانوس کر لو)۔'' ﴿ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ط﴾ (آیت ۲۶۰) ''پھر (انہیں ذبح کر کے) اُن کا ایک ایک ٹکڑا ایک ایک پہاڑ پر رکھ دو' پھر اُن کو پکارو' وہ تمہارے پاس دوڑتے چلے آئیں گے۔'' یہاں ﴿فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ﴾ ''تو انہیں اپنے ساتھ مانوس کر لو'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ پرندے آپ کو پہچان لیں جن کو آپ نے ٹکڑوں میں بانٹا ہے اور آپ اُن کو پہچان لیں کہ یہ وہی پرندے' کبوتر یا تیتر وغیرہ ہیں جن کے آپ نے ٹکڑے کیے ہیں' کوئی اور نہیں ہیں جو بلانے پر آ گئے ہوں۔ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا ثناء اللہ امرتسری کے لیے مسئلہ پیدا ہوا کہ اس سائنسی سوچ کے دَور میں یہ بات کیسے کہیں۔ لہٰذا انہوں نے تأویل کی کہ اس سے مراد یہ ہے کہ چار پورے پورے پرندے مختلف پہاڑوں پر رکھو اور انہیں پکارو تو وہ آ جائیں گے۔ اب یہ مشاہدہ تو ہر تیتر باز اور بٹیر باز کو ہوتا ہے کہ وہ خود سے مانوس تیتر یا بٹیر کو اپنے پاس بلاتا ہے' سیٹی بجاتا ہے تو وہ آ جاتا ہے۔ اگر اس سے یہی مراد ہے تو اِس قدر اہتمام کے ساتھ اور احیاءِ موتٰی پر اطمینانِ قلب حاصل کرنے کی دعا کے جواب میں یہ بات کیوں کہی گئی؟ جس میں ابتداءً ذرا ڈانٹ کا انداز بھی آ گیا کہ کیا تم ایمان نہیں رکھتے؟ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا کہ پروردگار! میں مانتا تو ہوں لیکن ذرا اطمینانِ قلبی درکار ہے۔ جب مولانا ثناء اللہ امرتسری سے کہا گیا کہ آپ نے اس آیت کی یہ تأویل کیوں کر دی' تو انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ میں کیا کروں' مجھے دوسروں کے سامنے بات پیش کرنی ہے۔ تو یہ ہے اصل بات کہ جس دَور کے لوگوں سے خطاب کرنا ہو اُن کے مسلّمات کا کچھ تو لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔

تو پہلی بات یہ جان لیجیے کہ اگر آپ نے کسی کے کسی وصف کو دائم اور مستقل بالذات مان لیا تو آپ شرک فی الصفات کے مرتکب ہو گئے۔ اس لیے کہ قائم و دائم' مستقل بالذات اور مطلق اوصاف تو صرف اللہ تعالیٰ کے ہیں' کسی اور کے اندر کوئی صفت' تأثیر یا وصف مستقل نہیں' مطلق نہیں' ہمیشہ سے نہیں اور ہمیشہ رہنے والا نہیں۔ ہر شے اور ہر ہستی کے اوصاف تابع ہیں اذنِ خداوندی کے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو اُن کا ظہور ہو گا ورنہ کسی صفت کی کوئی تأثیر ظاہر نہیں ہو سکتی۔

مذکورہ بالا سائنسی طرزِ فکر کی وجہ سے ذہنوں میں جو سوچ پختہ اور راسخ ہوئی ہے اسے ''مادہ پرستی کا شرک'' کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ ہمارا سارا توکل اور انحصار مادی اسباب و وسائل پر ہے' اگر یہ حاصل ہیں تو دلجمعی بھی حاصل ہے' یہ نہیں ہیں تو دل اُڑا ہوا ہے۔ اللہ کی قدرت پر اتنا یقین نہیں ہے جتنا کہ مادی وسائل کے نتائج پر یقین ہے۔ نتیجتاً سارا بھروسہ اور توکل ذاتِ خداوندی سے ہٹ کر مادی اسباب و وسائل کے ساتھ منسلک ہو گیا ہے۔ حکمتِ قرآنی کی جڑ توحید ہے اور ''تُعْرَفُ الْاَشْيَاءُ بِاَضْدَادِهَا '' کے مصداق توحید کو سمجھنے کے لیے شرک کو سمجھنا

پڑے گا۔ رات کو دن کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے اور دن کی حقیقت رات کے حوالے سے روشن ہوتی ہے۔ چنانچہ توحید کو سمجھنے کے لیے شرک کو سمجھنا ضروری ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف میں توحید کو مثبت انداز میں اور شرک کو منفی انداز میں خوب عیاں کیا گیا ہے۔ ان دونوں سورتوں کو میں ''حکمتِ قرآنی کے عظیم ترین خزانے'' قرار دیتا ہوں۔ سورۂ بنی اسرائیل کے بالکل آغاز میں فرمایا گیا:

﴿وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ﴿٢﴾﴾

''اور ہم نے موسیٰ کو کتاب (تورات) عطا فرمائی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت نامہ بنایا (رہنمائی قرار دیا) کہ میرے سوا کسی اور کو اپنا وکیل (کارساز) نہ بنالینا۔''

''وَکِیْـــلٌ'' کا مادہ 'و ' ك ' ل '' ہے اور مطلب ہے جس پر توکل اور بھروسہ ہو' جس سے اُمیدیں وابستہ ہوں' جس کو کارساز سمجھا گیا ہو' جس کو کسی بھی مسئلے میں اپنی مشکل کا حل سمجھا جا رہا ہو۔ سورۃ المؤمن میں مؤمنِ آلِ فرعون کے الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿٤٤﴾﴾ ''اور میں اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں' یقیناً اللہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے''۔ ''توحید فی التوکل'' یہی تو ہے کہ سارا بھروسہ' دار و مدار اور انحصار اسباب و وسائل کے بجائے اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو۔ اسباب و وسائل کی نفی قطعاً نہیں ہے' لیکن یہ کہ کوئی بھروسہ اُن پر قطعاً نہ ہو۔ سورۃ الانفال میں فرمایا گیا: ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ......﴾ (آیت ۶۰) ''اور اپنی امکانی حد تک ان (کفار) کے مقابلے کے لیے طاقت تیار رکھو''۔ یعنی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہنے کے بجائے جتنے بھی اسباب و وسائل فراہم کر سکتے ہو کرو' لیکن تمہارا توکل ان اسباب و وسائل پر نہ ہو۔ یہ حقیقت ذہن نشین رہے کہ اسباب سے کچھ نہیں ہوگا' بلکہ ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا۔ اور اللہ بغیر اسباب کے بھی نتیجہ پیدا کر سکتا ہے' وہ اسباب کا محتاج قطعاً نہیں' اور اللہ تعالیٰ اسباب کے ہوتے ہوئے الٹا نتیجہ بھی برآمد کر سکتا ہے' وہ اسباب کا پابند نہیں۔

ان دونوں میں سے کوئی پہلو بھی اگر آپ کے ذہن میں ہے تو آپ ''شرک فی التوکل'' کے اندر ملوث ہو گئے۔ میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ آپ نے کہیں جانا ہے اور آپ کے پاس کار یا کوئی اور سواری درست حالت میں موجود ہے' آپ نے اس کے لیے پٹرول کا انتظام بھی کر لیا ہے اور آپ نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ آپ صبح اُٹھ کر لازماً اپنی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ اگر آپ کو یقین ہو گیا ہے کہ اب آپ کے روانہ ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے اور آپ یہ بھول گئے ہیں کہ ان اسباب کے اوپر ایک مُسبّب الاسباب ہستی بھی ہے اور سارے وسائل کے جمع ہونے کے باوجود بھی آپ اُس کے اِذن کے بغیر ہل نہیں سکتے تو آپ گویا مادہ پرستی کے شرک میں مبتلا ہو گئے' شرک فی التوکل میں ملوث ہو گئے۔ یہ اصل میں مجوبیت ہے کہ آپ اسباب کے پردے میں مجوب ہو گئے' اسباب کا یقین آپ کے دلوں میں پیدا ہو گیا۔ آپ کے ذہن میں اسباب پر توکل پیدا ہو گیا' آپ نے اپنے دل کے سنگھاسن پر مادی اسباب و وسائل کو بٹھا دیا' اللہ سے نگاہیں مجوب رہ گئیں۔ جیسے اقبال نے کہا: ؎

بُتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

ہمارا طرزِ عمل ہمیشہ یہی ہونا چاہیے کہ جب بھی کسی کام کا ارادہ کریں تو مقدور بھر اسباب و وسائل بروئے کار لانے کے بعد زبان پر الفاظ ہوں ''اِن شاء اللہ'' اور دل میں یہ پختہ یقین ہو کہ تمام اسباب و وسائل اذنِ خداوندی کے محتاج ہیں اور نتیجہ وہی نکلے گا جو اللہ چاہے گا۔ اسباب و وسائل پر یقین کرتے ہوئے کبھی یہ نہیں کہنا چاہیے کہ ''میں کل یہ کام ضرور کروں گا''۔ اگر کوئی عامی انسان یہ کہہ رہا ہو تو اس کی فوری پکڑ نہیں ہوگی' اس لیے کہ اس کی اپنی ذہنی سطح ہے' اسے ابھی وہ قلبی ترفّع حاصل نہیں ہوا' وہ تو اسباب و وسائل ہی کے چکر میں ہے' لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر نبی کریم ﷺ کی گرفت فرمائی۔ مشرکین مکہ نے آپ ﷺ سے کچھ سوالات کیے کہ ذرا بتائیے اصحاب کہف کون تھے' روح کی حقیقت کیا ہے' ذوالقرنین کون تھا؟ تو رسول اللہ ﷺ نے یہ سوچ کر کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام آتے ہی رہتے ہیں' ان سے پوچھ لوں گا' کہہ دیا: ''میں کل جواب دے دوں گا'' اور ''اِن شاء اللہ'' نہ کہا' تو آپ ؐ کی گرفت ہو گئی۔ اس لیے کہ ''حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ'' کہ بہت سی چیزیں جو اَبرار کے لیے نیکیاں ہو سکتی ہیں وہی مقربین کے لیے قابل گرفت ہو سکتی ہیں' ان کے مرتبے سے فرو ہو سکتی ہیں۔ اب حضرت جبرائیل ؑ نہیں آ رہے اور لوگ تالیاں پیٹ رہے ہیں کہ محمدؐ! کیا جوابات ہیں اِن سوالوں کے؟ نبی اکرم ﷺ خاموش ہیں۔ آپ ذرا سوچیے کہ یہ نبی اکرم ﷺ کے لیے کس قدر تشویش ناک اور نازک صورت حال ہوگی۔ لیکن یہ کہ حکمتِ خداوندی یہی تھی کہ آپ ؐ کی گرفت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّىْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿٢٣﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ﴾ (الکہف: ۲۳' ۲۴)

''اور (اے نبیؐ!) کسی چیز کے بارے میں کبھی یہ نہ کہا کرو کہ میں کل یہ کام کروں گا' مگر (اس استثناء کے ساتھ کہ) اگر اللہ نے چاہا۔''

اس کے بعد سورۃ الکہف میں اُن سوالات کے جوابات نازل فرمائے گئے۔

تو یہ ہے اصل میں ''توحید فی التوکل'' کہ کسی شے سے کچھ نہیں ہوسکتا' جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔

اس کے علاوہ سورۃ الکہف کے پانچویں رکوع میں اس شرک کی مختلف پہلوؤں سے وضاحت ہوئی ہے۔ اس میں دواشخاص کا مکالمہ بڑی تفصیل سے نقل ہوا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ واقعہ ہوا ور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ تمثیلی پیرایہ ہو۔ ان دواشخاص میں سے ایک درویشِ خدامست تھا۔ اس کے پاس دنیاوی اسباب ووسائل اور مال ودولت نہیں تھی' لیکن اللہ پر اس کا کامل یقین اور توکل تھا۔ وہ معرفتِ خداوندی اور اللہ پر ایمان سے سرشار تھا' جبکہ دوسرا سرمایہ دارِ مال مست تھا۔ قرآن مجید میں یہ واقعہ بایں الفاظ بیان ہوا ہے:

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿۳۲﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿۳۳﴾ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ج﴾

''اور (اے نبیؐ!) ان کے سامنے مثال بیان کیجیے دواشخاص کی' ان میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دیے اور ان کے گرد کھجور کے درختوں کی باڑ لگائی اور اُن کے درمیان کاشت کی زمین رکھی۔ (یعنی پھل کے ساتھ ساتھ اجناس بھی پیدا ہو رہی تھیں) دونوں باغ خوب پھلے پھولے اور بارآور ہونے میں انہوں نے ذرا سی کسر بھی نہ چھوڑی اور ان باغوں کے اندر ہم نے ایک نہر جاری کردی (یعنی آب پاشی کا نظام بھی موجود تھا اور باغ کبھی سوکھا نہیں تھا)۔ مزید یہ کہ اس کا ثمر بھی تھا''۔ [اس سے یہ مراد بھی لی گئی ہے کہ وہ صاحب اولاد بھی تھا اور یہ بھی کہ باغ پھلوں سے لدا پھندا تھا]

﴿فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾﴾

''پس اس نے اپنے ساتھی (درویشِ خدامست) سے کہا جو کہ اُس سے ہم کلام تھا (خیر اور بھلائی کی کوئی بات کر رہا تھا' کچھ خوفِ خدا دلا رہا تھا) کہ میں تجھ سے زیادہ مال دار ہوں اور تجھ سے زیادہ طاقت ورنفری رکھتا ہوں''۔

یعنی اس کا دُنیوی مال ومتاع اور اسباب ووسائل پر مکمل بھروسہ ہو گیا۔ آج کل کے زمانے میں یوں سمجھئے کہ کسی شخص کے پاس دو بڑی بڑی ملیں (mills) ہوں اور اس نے ایک بڑا فارم بھی لگایا ہوا ہو۔ آب پاشی کے لیے بھی اس کا اپنا نظام ہو اور بجلی کے لیے واپڈا پر انحصار کرنے کے بجائے اس نے اپنا ہی دیوقامت جنریٹر لگالیا ہو اور دوسال تک کے لیے ڈیزل بھی مہیا کر رکھا ہو' تو اُس شخص کے دل میں جو خناس پیدا ہوگا وہ اُس سرمایہ دارِ مال مست کے دل میں پیدا ہو گیا تھا' لہٰذا اُس درویشِ خدامست کے جواب میں اُس نے کہا: ''میں تجھ سے زیادہ مال دار ہوں اور تجھ سے زیادہ طاقت ورنفری رکھتا ہوں۔'' تم خود تو جوتیاں چٹخارتے پھرتے ہو اور ہمیں آئے ہو نصیحت کرنے! ہمارے پاس یہ جو مال ومتاع اور ساز وسامان ہے آخر یوں ہی تو نہیں ہمیں مل گیا! آخر ہمارے اندر کچھ ذہانت وفطانت ہے' ہم نے کچھ سوچا اور محنت کی ہے' تب ہی تو یہ چیزیں ہمیں حاصل ہوئی ہیں!

آگے فرمایا: ﴿وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ج﴾ ''اور (یہ کہتے ہوئے) وہ اپنے باغ میں داخل ہوا جبکہ وہ اپنے اوپر ظلم کر رہا تھا''۔ جب اس نے باغ کا لہلہاتا ہوا منظر دیکھا تو اس کا نشہ دوآتشہ ہو گیا اور اس کے دل میں ایک خناس سا پیدا ہو گیا۔ ﴿قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿۳۵﴾ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً لا﴾ ''اس نے کہا: میں نہیں سمجھتا کہ میرا یہ باغ کبھی بھی تباہ ہوسکتا ہے' اور مجھے توقع نہیں کہ قیامت کی گھڑی کبھی آئے گی''۔ تم خواہ مخواہ مجھے خدا سے اور بُرے انجام سے ڈراتے ہو۔

دیکھئے یہ تھا وہ جہل مرکب جو اُس کے اندر پیدا ہوا۔ اس کے اعتقادات ونظریات میں کہیں بھی کسی دیوی دیوتا کا ذکر نہیں ہے۔ ذکر ہے تو اسباب ووسائل اور دُنیوی ساز وسامان کا ہے۔ اُس نے کہیں یہ نہیں کہا کہ یہ فلاں دیوی کا مجھ پر کرم ہے اور فلاں دیوتا کی مجھ پر کرپا ہے۔ بلکہ اس کے اگلے الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ماننے والا ایک ربّ ہی کا ہے۔ ﴿وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾﴾ ''تاہم اگر کبھی مجھے اپنے ربّ کے حضور لوٹایا بھی گیا تو میں ضرور اس سے بھی زیادہ شاندار جگہ پاؤں گا''۔ جب میرے اندر یہ صلاحیتیں ہیں کہ مجھے یہاں اتنا کچھ ملا ہے تو وہاں اس سے بڑھ کر ملے گا۔ تم یہاں جوتیاں چٹخار رہے ہو تو وہاں بھی جوتیاں چٹخاروگے۔ یہ ہے اس کا وہ خناس جو ظاہر ہوا۔

اب اُس بندۂ خدا کا جواب ملاحظہ فرمایئے: ﴿قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾﴾ ''اُس (درویشِ خدامست) نے اُس (سرمایہ دارِ مال مست) سے کہا جو اُس سے ہم کلام تھا کہ کیا تو نے کفر کیا اُس ذات کا جس نے تجھے مٹی سے' پھر نطفے سے پیدا کیا' پھر تجھے ایک مکمل انسان بنا دیا؟'' ﴿لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۳۸﴾﴾ ''لیکن میرا ربّ تو وہی اللہ ہے (میں تو اس ایک ہی ربّ کا ماننے والا ہوں) اور میں اپنے ربّ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا''۔ ﴿وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ لا لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ج﴾ ''اور (اے بدبخت!) یہ کیوں نہ ہوا کہ تو جب اپنے باغ میں داخل ہوا تھا تو کہتا جو کچھ اللہ چاہے (وہی ہوگا) کوئی زور نہیں (نہ میرا نہ کسی اور کا) مگر اللہ ہی کی توفیق وتائید سے''۔

یہ ’’ماشاءاللہ‘‘ کیا ہے؟ یہ کہ انسان کوئی سہانا منظر اور نعمت وغیرہ دیکھے اور سمجھے کہ یہ سب کچھ اللہ کی مشیت کا ظہور ہے‘ اس کا کرم اور مہربانی ہے‘ اسی کی دین ہے‘ یہ میری قوتوں‘ میری صلاحیتوں اور میری توانائیوں کا ظہور نہیں ہے! یہ ہے اصل میں توحید کہ اگر آپ کہیں گھر میں داخل ہوں اور وہاں آپ کو کوئی اچھا منظر نظر آئے‘ بچے کھیل رہے ہوں‘ گھر کے اندر خوشی کا ماحول ہو‘ ایک ہنستا بستا ہرا بھرا گھر ہو تو فوراً زبان سے نکلنا چاہیے ’’ماشاءاللہ‘‘۔ نگاہ کہیں اسباب و وسائل کی طرف منتقل نہ ہو جائے‘ بلکہ نگاہ کو ایک ہی زقند میں پہنچنا چاہیے مُسبّب الاسباب تک کہ وہ ہے جس کے فضل کا یہ ظہور ہے‘ یہ کسی اور کی کوئی مہارت‘ کاریگری‘ ہوشیاری اور کسی اور کی ذہانت وفطانت نہیں ہے۔

اس درویشِ خدامست نے پھر کہا: ﴿اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿٣٩﴾ فَعَسٰى رَبِّىْۤ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ﴿٤٠﴾ اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿٤١﴾﴾ ’’اگر تو مجھے مال اور اولاد میں اپنے سے کمتر پا رہا ہے‘ تو مجھے یقین ہے کہ میرا ربّ (اگر چاہے تو) مجھے تیرے باغ سے بہتر باغ عطا کر دے اور (تیرے) اس (باغ) پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے کہ وہ چٹیل میدان بن کر رہ جائے (جہاں خاک اڑ رہی ہو)۔ یا اس کا پانی زمین کے اندر اتر جائے اور تو (کسی طرح سے بھی) پانی کو کھینچ کر نہ لا سکے‘‘۔

یہ وہ درویشِ خدامست کی بات تھی جو اُس کی زبان سے نکلی۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((رُبَّ اَشْعَثَ مَدْفُوْعٍ بِالْاَبْوَابِ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ))(۱) یعنی ’’اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اگرچہ پراگندہ بالوں والے ہوتے ہیں‘ دروازوں سے ان کو دھتکار دیا جاتا ہے‘ لیکن اگر وہ کسی بات پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کی لاج رکھتا ہے‘‘۔

اور یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ ﴿وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ﴾ ’’اور کھینچ لیا گیا (ختم کر دیا گیا) اس کا سارا ثمر‘‘۔ ہو سکتا ہے کوئی ایسی وبا آئی ہو کہ ساری اولاد ہی ہلاک ہو گئی ہو اور کوئی ایک ایسا بگولا آیا ہو جو اُس کے پورے کے پورے باغ کو جھلسا کر چلا گیا ہو۔ ﴿فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَاۤ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا﴾ ’’اب وہ باغ پر اپنی لگائی ہوئی لاگت پر اپنی ہتھیلیاں ملتا رہ گیا‘ جبکہ وہ اپنی ٹٹیوں پر الٹا پڑا ہوا تھا‘‘ یعنی اس بات پر افسوس کہ میری ساری عمر کی محنت اور کمائی اس پر لگی ہوئی تھی اور یہ چشم زدن میں ختم ہو گئی۔ ﴿وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِىْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّىْۤ اَحَدًا ﴿٤٢﴾﴾ ’’اور وہ کہنے لگا کاش کہ میں نے اپنے ربّ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہوتا!‘‘

اب یہاں دیکھئے کہ یہ کون سا شرک مراد ہے؟ اس پورے واقعہ میں کسی بعل کا‘ کسی دیوی یا دیوتا کا اور کسی لات ومنات اور عزیٰ کا کوئی ذکر نہیں۔ ذکر ہے تو ربّ کا ہے کہ ﴿وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّىْ﴾ ’’اور اگر کبھی میں اپنے ربّ کی طرف لوٹا دیا گیا.....‘‘ یہ اصل میں مادے اور اسباب و وسائل پر توکل ہے‘ اپنی توانائیوں‘ ذہانت‘ دُور اندیشی اور معاملہ فہمی کا گھمنڈ ہے جسے مذکورہ بالا رکوع میں شرک سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ مادہ پرستی کا شرک ہے جو پہلے شاید شاذ ہوتا ہو‘ لیکن آج کائناتی (universal) ہے۔ سائنس اسی بنیاد پر پروان چڑھی اور اُبھری ہے۔ یہ اس کائنات کے تمام مظاہر فطرت (phenomena) کو ایسے بیان کرتی ہے کہ یہ خود کار نظام ہے اور اس میں طبیعی قوانین عمل پیرا ہیں۔ مثلاً بھاپ اٹھی‘ ہوا اُسے اِدھر سے اُدھر لے گئی‘ بادل بنے اور بارش برسی۔ اس میں کہیں خدا کی مشیت‘ خدا کے ارادہ‘ خدا کے اِذن کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کا مجموعی اثر یہ ہوا ہے کہ اگر خدا کا اقرار ہے بھی تو محض اس حد تک کہ وہ معاذ اللہ کسی کونے میں بیٹھ گیا ہے اور یہ کائنات خود بخود چل رہی ہے۔ ہمارا سارا توکل اور اعتماد مادی اسباب و وسائل پر ہے۔ اور اس شرک فی التوکل یا مادہ پرستی کے شرک میں کم و بیش ہم میں سے ہر شخص مبتلا ہے۔

اس کو ایک حدیث کے حوالے سے سمجھئے۔ نبی اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ زُہد کی تعریف اس طرح بیان فرمائی کہ:

((اَلزَّهَادَةُ فِى الدُّنْيَا لَيْسَتْ بِتَحْرِيْمِ الْحَلَالِ وَلَا اِضَاعَةِ الْمَالِ وَلٰكِنَّ الزَّهَادَةَ فِى الدُّنْيَا اَنْ لَا تَكُوْنَ بِمَا فِيْ يَدَيْكَ اَوْثَقَ مِمَّا فِيْ يَدَيِ اللّٰهِ))

’’دنیا میں زہد (اپنے اوپر) حلال کو حرام کر لینے اور مال و دولت کو ضائع کرنے کا نام نہیں ہے‘ بلکہ دنیا میں زہد تو یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھوں میں ہے اس پر تمہارا توکل اور اعتماد زیادہ نہ ہو جائے اس چیز سے جو اللہ کے ہاتھ میں ہے‘‘۔

یعنی تم عام طور پر سمجھتے ہو کہ حلال چیزوں کو بھی اپنے اوپر حرام ٹھہرا لیا جائے تو یہ زہد ہے‘ یعنی نہ اچھا کھانا‘ نہ اچھا پہننا‘ حالانکہ اللہ نے یہ چیزیں حلال کی ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِىْۤ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط﴾ (الاعراف:۳۲)

’’(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کس نے اللہ کی اُس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں (ممنوع کر دیں)؟‘‘

بلکہ زُہد تو یہ ہے کہ جو کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اس پر تمہارا وثوق‘ اعتماد اور توکل زیادہ ہو جائے اس سے کہ جو تمہارے ہاتھ میں ہے‘ یعنی اسباب و وسائل اور دولت وغیرہ۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ جیب میں پیسہ ہے تو دل کو سکون ہے‘ جیب میں پیسہ نہیں تو دل اڑا ہوا ہے‘ اس لیے کہ اللہ کے خزانوں پر‘ اللہ کی رزّاقیت اور قدرت پر ہمارا اتنا اعتماد اور یقین نہیں جتنا کہ پیسے پر ہے‘ بلکہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ اب اسے شرک کہہ لیں یا کفر کہہ لیں۔ جیسے ایک درویش نے کہا ہے: ’’جو دم غافل سو دم کافر‘‘ کہ انسان کا جو سانس غفلت میں بسر ہوتا ہے تو درحقیقت اس کا وہ وقت ایک نوع کے کفر میں گزرتا ہے۔ علامہ اقبال نے کتنی خوبصورت بات کہی ہے ؎

بتوں سے تجھ کو امیدیں ، خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

دیکھئے نبی اکرم ﷺ نے توحید کی کتنی تلقین کی ہے! آپؐ نے اپنے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کو تاکید فرمائی کہ اس بات کو ذہن نشین کرلو کہ ''اگر تمام انسان مل کر تجھے کوئی نفع پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر وہی کچھ جو اللہ نے تمہارے حق میں لکھ دیا ہے' اور تمام انسان مل کر اگر تجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر وہی کچھ جو اللہ نے تمہارے خلاف لکھ دیا ہے۔'' جب تک انسان کے اندر یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی کہ تمام بیم و رجاء کا مرکز اللہ کی ذات ہو جائے' ماسوی اللہ سے امید اور خوف دونوں منقطع ہو جائیں تو گویا اصل توحید حاصل نہیں۔ توحید کا نام ہی تو ولایتِ خداوندی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾﴾ (یونس) ''سنو! جو اللہ کے دوست ہیں ان کے لیے یقیناً کسی خوف اور غم کا موقع نہیں ہے''۔ ان کی امیدیں اور ان کا خوف سب ماسوی اللہ سے کٹ کر اللہ کی ذات پر مرتکز ہو جاتا ہے۔ امید ہے تو اللہ سے اور خوف ہے تو اللہ سے۔ اُن کا ایمان اور یقین ہوتا ہے کہ کسی اور کے کیے کچھ نہیں ہو سکتا جب تک اللہ نہ چاہے۔ کوئی میری بگڑی نہیں بنا سکتا جب تک کہ اللہ نہ چاہے' کوئی میری تکلیف رفع نہیں کر سکتا اگر اللہ نہ چاہے۔ تو خوف اور امید دونوں جب تک جملہ مخلوقات سے منقطع ہو کر اللہ کی ذات سے منسلک نہ ہو جائیں انسان توحید کا لذت آشنا نہیں ہو سکتا۔ آج کا انسان اس مادہ پرستانہ فکر کی وجہ سے اس سے بہت محروم ہو چکا ہے۔ البتہ زبان سے لا الٰہ کہہ دینا آسان ہے' اس میں کوئی مشکل نہیں پڑتی۔

بعض مذہبی نزاعات اور ان کا حل

اب آیئے ذرا ''شرک فی الصفات'' کے کچھ دوسرے پہلوؤں کی طرف کہ جن سے بعض مذہبی نزاعات رونما ہوئے ہیں۔ شاید آپ کو ان کا کوئی حل میسر آ جائے۔ صفاتِ باری تعالیٰ کے باب میں ایک بات تو یہ جان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے قرآن مجید میں بہت سے الفاظ استعمال ہوئے ہیں بطور صفت بھی اور بطور اسماء بھی۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات میں بہت تھوڑا فرق ہے۔ جب اُس لفظ کو حالت نکرہ میں لاتے ہیں تو وہ اللہ کی صفت ہے اور جب اسے معرّف باللّام کرتے ہیں تو وہ اللہ کا نام ہے۔ مثلاً ''سمیعٌ'' اللہ کی صفت ہے کہ اللہ سننے والا ہے' جبکہ ''السمیع'' اللہ کا نام ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کی معرفت اس کے اسماء و صفات ہی کے حوالے سے حاصل ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں: ''اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَآئِهٖ وَصِفَاتِهٖ'' کہ میں اللہ پر ایمان لایا جیسا کہ وہ اپنے اسماء اور صفات سے ظاہر ہے۔ تو ہمارا اللہ کے ساتھ جو ذہنی اور قلبی رشتہ ہے وہ اس کے اسماء و صفات کے حوالے سے ہے۔

قرآن مجید یہ بھی کہتا ہے: ﴿لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ ''جتنے اچھے نام ہیں اسی کے ہیں''۔ پھر یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ کے لیے قرآن مجید میں جو نام آ گئے ہیں وہ تو یقیناً اللہ کے ہیں اور جن صفات کا اثبات ہو گیا ہے وہ اللہ کے لیے ثابت ہیں' لیکن چند صفات کو بنیادی قرار دیا گیا ہے کہ بقیہ صفات انہی کی فروع اور شاخیں (corollaries) ہیں۔ مثلاً صفتِ علم اللہ تعالیٰ کی ایک بنیادی صفت ہے اور سمیع' بصیر' لطیف' خبیر' یہ تمام اصل میں علم ہی کے مختلف شعبے اور شاخیں ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ''قدرت'' ہے۔ اب اس کے ذیل میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے نام آ جائیں گے' مثلاً: اَلْمُعِزُّ ''عزت دینے والا' اَلْمُذِلُّ ''ذلیل کرنے والا' الرَّافِع ''اٹھانے والا' الْخَافِض ''گرانے والا' الباسِط ''کشادگی دینے والا'' القَابِض ''تنگی دینے والا' یہ سب اس کی صفتِ قدرت ہی کی شروح اور اس کی شاخیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفات یہ ہیں (اگرچہ مختلف علماء' محققین اور متکلمین کے ہاں یہ مختلف ہیں): (۱) وجود (۲) حیات' (۳) قدرت' (۴) علم' (۵) ارادہ' (۶) کلام۔ وہ الحیّ ہے' زندہ ہے' اس کا وجود حیات والا ہے۔ وہ صاحب قدرت ہے' صاحب علم ہے' صاحب ارادہ ہے' متکلم ہے' کلام کرتا ہے۔ اِن تمام صفات کے ساتھ جب آپ تین چیزیں جوڑ لیں گے کہ اس کی حیات مطلق ہے' اس کی حیات ذاتی ہے اور اس کی حیات قدیم ہے تو یہ توحید ہے۔ اور اگر مطلق ہونے میں' قدیم ہونے میں اور ذاتی ہونے میں کسی اور کو کسی پہلو سے شامل کر لیا گیا تو یہ شرک ہے۔ ماسوی اللہ کی حیات ذاتی نہیں عطائی (اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ) ہے' مطلق نہیں مقید اور محدود ہے' قدیم نہیں حادث ہے۔ اگر یہ چیزیں پیشِ نظر رہیں تو توحید میں کوئی خلل نہیں آئے گا۔ لیکن اگر ان میں سے کسی ایک چیز کو کسی ایک پہلو سے مجروح کر دیا گیا تو یہ شرک بن جائے گا۔

اب جان لیجیے کہ علم کے بارے میں توحید کیا ہے۔ اللہ کا علم ذاتی ہے جبکہ ماسوی اللہ کا علم عطائی ہے۔ ماسوی میں سب شامل ہیں۔ جب فرشتوں سے کہا گیا کہ بتاؤ ذرا ان چیزوں کے نام تو اُن کا جواب تھا: ﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ط﴾ (البقرۃ: ۳۲) ''تو پاک ہے (اے پروردگار!) ہمیں کوئی علم حاصل نہیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں سکھایا (عطا کیا) ہے''۔ تو معلوم ہوا کہ فرشتے ہوں' انبیاء ہوں' رسول ہوں' اولیاء اللہ ہوں' کوئی بڑے سے بڑا اعلیٰ منہ' فھا مہ ہو' کیسے باشد' سب کا علم عطائی ہے ذاتی نہیں' حادث ہے قدیم نہیں' محدود ہے مطلق اور لامتناہی نہیں۔ یہ تینوں قیود اگر موجود ہیں تو شرک نہیں ہے' اور اگر ان میں سے ایک قید بھی ہٹ گئی تو شرک ہو جائے گا۔

مسئلۂ علمِ غیب

اب ذرا ''علم غیب'' کے مسئلے کو حل کر لیجیے! یہ ہمارے ہاں کے مہتم بالشان مسائل میں سے ایک ہے اور اس میں بہت طویل بحثیں اور جھگڑے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو علمِ غیب حاصل ہے یا نہیں؟ ایک طرف سے اس کی پُر زور نفی ہے اور ایک طرف سے اثبات ہے کہ نبی اکرم ﷺ ''عالمُ الکُل'' اور ''عالم مَا کَانَ وَمَا یَکُوْنُ'' ہیں۔ اور اِن دونوں مکتب ہائے فکر میں جو رسہ کشی ہے وہ دراصل ''علم غیب'' کی تعریف (definition) کا اختلاف ہے۔ مجھ میں الحمدللہ معاملے کی تحقیق کا داعیہ ہے کہ کسی بھی معاملے کی اچھی طرح سے تحقیق کر لی جائے' اور یہ اللہ تعالیٰ کے مجھ پر احسانات میں سے ایک احسان ہے۔ میں ابھی میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھا کہ ساہیوال میں ایک بریلوی مکتب فکر کے عالم دین کے پاس گیا اور پوچھا کہ علم غیب کے بارے میں کیا اختلاف پایا جاتا ہے اور اس میں آپ کا موقف کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے علم کے بارے میں یہ تینوں قیدیں مانتے ہیں کہ آپؐ کا علم ذاتی نہیں عطائی ہے' آپؐ کا علم قدیم نہیں حادث ہے' آپؐ کا علم غیر محدود نہیں محدود ہے۔ بلکہ انہوں نے مجھے اس پر اپنے مکتب فکر کے علماء کی تحریریں دکھائیں کہ ہماری طرف سے ان تینوں باتوں کا برملا اعتراف اور اقرار ہوتا ہے۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ کم از کم ان تینوں چیزوں کو اگر تسلیم کیا جائے تو پھر میرا آپ سے کوئی جھگڑا نہیں ہے اور میرے نزدیک اس میں شرک والی بات نہیں ہے۔ تو دراصل اختلاف کی وجہ صرف یہ ہے کہ علم غیب کی definition مختلف ہو رہی ہے۔ جو اِس غیب کی نفی کرتے ہیں وہ اسے کسی اور طریقے سے define کرتے ہیں اور جو غیب کا اثبات کرتے ہیں وہ اسے کسی اور طرح سے define کرتے ہیں۔ جو اس کا اثبات کر رہے ہیں وہ بھی درست ہیں اور جو نفی کر رہے ہیں وہ بھی درست ہیں' لیکن ایک جھگڑا ہے کہ حل نہیں ہو رہا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لیے جو ''غیب'' کا لفظ کئی بار آیا ہے کہ ﴿عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ﴾ ''وہ غیب اور حاضر کا جاننے والا ہے'' تو یہ ہمارے اعتبار سے ہے۔ اللہ کے لیے تو کوئی چیز غیب ہے ہی نہیں۔ ہر شے آنِ واحد میں اس کے سامنے حاضر ہے۔ اس کے لیے غیب کا کیا سوال ہے! اللہ کے لیے اگر غیب کا تصور بھی آپ کریں گے تو کفر ہو جائے گا۔ جو چیزیں اللہ نے انسانوں کی نگاہ سے اوجھل رکھی ہیں وہ غیب ہیں۔ اس لیے کہ ہمیں اس دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اگر سارے حقائق ہماری نگاہوں کے سامنے ہوں تو پھر امتحان کیسا! اگر جنت نگاہوں کے سامنے ہو' دوزخ بھڑکتی نظر آ رہی ہو اور فرشتے نگاہوں کے سامنے موجود ہوں تو کون فرعون' کون نمرود' کون ابوجہل ہوگا جو انکار کرے گا! وہ تو سب کے سب ایمان لے آئیں گے اور پورے پورے مؤمن ہوں گے۔ اس لیے کہ غیب تو پھر شہادہ بن کر سامنے آ جائے گا۔ جبکہ امتحان تو اسی میں ہے کہ مانو ہمیں غیب میں رہتے ہوئے' مانو فرشتوں کو اِس کے باوجود کہ وہ تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہیں' مانو جنت اور دوزخ کو اس کے باوجود کہ وہ تمہارے لیے غیب ہیں۔ تو اس لفظ ''غیب'' کو اگر سمجھ لیا جائے تو جھگڑا باقی نہیں رہتا۔

دراصل انسانوں کے علم کے آگے ایک پردہ حائل کر دیا گیا ہے اور علم کو شہادہ اور غیب میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ جس کو نبوت عطا کرتا ہے تو اسے اس غیب والے علم میں سے کچھ حصہ دیتا ہے' تبھی تو وہ نبی بنتا ہے! اگر اس کا علم بھی ہمارے علم کی طرح ہو تو وہ نبی کیسے ہو گیا! اسے تو جنت کی سیر کرائی جاتی ہے جو میرے اور آپ کے لیے غیبِ مطلق ہے۔ اسے دوزخ کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے جو ہمارے لیے غیب ہے۔ فرشتے اس کے سامنے ہوتے ہیں۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ان کی اصل مَلَکی شکل میں نبی اکرم ﷺ نے دو مرتبہ دیکھا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی ﴿۱۳﴾ عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَھٰی ﴿۱۴﴾ عِنْدَھَا جَنَّۃُ الْمَاْوٰی ﴿۱۵﴾ اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ﴿۱۷﴾ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی ﴿۱۸﴾﴾ (النجم)

''اور ایک مرتبہ پھر اُس نے سِدْرَۃُ الْمُنْتَھٰی کے پاس اُس کو (جبرائیلؑ کو) اترتے دیکھا' جہاں پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔ اُس وقت سِدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ چندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی۔ اور اس نے اپنے ربّ کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں''۔

یہ مشاہدات عالمِ غیب کے ہیں نہ کہ عالمِ شہادہ کے۔ یہ جنت اور دوزخ کے مشاہدات ہیں' یہ عالم ملکوت کے پردے اٹھائے جا رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَکَذٰلِکَ نُرِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ......﴾ (الانعام:۷۵)

''اور اسی طرح ہم ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے ملکوت کا مشاہدہ کراتے رہے......''

تو معلوم ہوا کہ عام انسانوں کے لیے جو چیزیں غیب کے درجے میں ہوتی ہیں نبی کو اُن میں سے کچھ دیا جاتا ہے تب ہی وہ نبی بنتا ہے' ورنہ نبوت کا سوال ہی نہیں۔ اس کو قرآن مجید نے واضح کر دیا ہے۔ سورۃ الجن میں فرمایا گیا:

﴿عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْھِرُ عَلٰی غَیْبِہٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ ......﴾ (الجن:۲۶'۲۷)

''اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے' وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا' مگر اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہے......''

البتہ ماسویٰ اللہ کے لیے کُل غیب کے احاطے کا اگر تصور بھی ہو گیا تب تو کفر بھی ہو گیا اور شرک بھی ہو گیا۔ کُل غیب تو دُور کی بات ہے' اگر کُل حاضر کا تصور بھی ذہن میں آ گیا تو یہ بھی کفر اور شرک ہے۔

جس طرح ''شرک فی الذات'' کے ضمن میں قرآن مجید کا اہم ترین مقام سورۃ الاخلاص ہے' اسی طرح ''شرک فی الصفات'' یا بالفاظِ دیگر ''توحید فی الصفات'' کے ذیل میں قرآن مجید کا عظیم ترین مقام آیت الکرسی ہے۔ اس میں فرمایا گیا: ﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ﴾ ''اور وہ احاطہ نہیں کر سکتے اللہ کے علم میں سے کسی بھی شے کا' سوائے اس کے جو اللہ چاہے''۔ علمِ حاضر بھی اللہ ہی کا عطا کردہ ہے' ہمارا ذاتی نہیں ہے۔ آنکھ دیکھ رہی ہے تو اسے اللہ دکھا رہا ہے تو دیکھ رہی ہے' ورنہ آنکھ کے بس کا روگ نہیں ہے کہ دیکھ سکے۔ کان بھی سن رہے ہیں تو اللہ کے سنوانے سے سن رہے ہیں' ورنہ کانوں کا ذاتی وصف نہیں ہے کہ وہ سن سکیں۔ مخلوق کے ذاتی وصف اور صفت کا تو ہم نے انکار کر دیا۔ اس کا تو سوال ہی نہیں۔ ذاتی وصف اور ذاتی صفت تو ہے ہی صرف اللہ کے لیے۔ لہٰذا علمِ حاضر کے جو ذرائع ہیں وہ بھی جان لیجیے کہ ہمارے ذاتی نہیں' عطائی ہیں اور اِن کا بھی اللہ تعالیٰ نے دائرہ مقرر کر دیا ہے۔ آنکھ کی جو حد ہے اتنا ہی دیکھے گی اس سے آگے نہیں۔ البتہ خوردبین لگا کر کچھ مزید دیکھ لے گی' لیکن پھر خوردبین کی بھی ایک حد ہے جس سے تجاوز ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا علمِ حاضر ہو یا علمِ غیب' اگر ماسویٰ اللہ کے لیے کُل کا احاطہ کریں گے تو شرک ہو جائے گا' ورنہ نہیں۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ ہم انبیاء کے علم کو ناپیں اور تولیں تو اس سے بڑا پاگل پن اور اس سے بڑی حماقت کوئی نہیں۔ اس لیے کہ وہ تو نوعیت کے اعتبار سے بھی ہمارے علم سے مختلف ہے۔ اسے ہم کیسے ناپیں گے! ہمارا علم تو علم بالحواس اور علم بالعقل ہے' جبکہ وہ علم' علم بالوحی ہے۔ لہٰذا جب حصولِ علم کے ذرائع اور مآخذ ہی مختلف ہوں اور ہم اپنے علم سے اُس علم کو ناپنے لگ جائیں تو اس سے بڑی حماقت اور اس سے بڑا ظلم کوئی نہیں ہے۔ ظلم کی تعریف ہے: ''وَضْعُ الشَّيْءِ فِي غَيْرِ مَحَلِّهٖ'' کہ کسی شے کو اُس کے اصل مقام سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دینا۔ اسے منطق میں ''قیاس مع الفارق'' کہتے ہیں کہ جو چیزیں بنیادی طور پر اور تقسیم کے اعتبار سے ہی مختلف ہوں آپ ان کو ایک دوسرے پر قیاس کریں اور ان کو ایک دوسرے کے پیمانوں سے ناپ رہے ہوں۔ اور یہی ہے اصل مغالطہ۔ اللہ تعالیٰ نے جتنا علم چاہا محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو دے دیا۔ ہم کون ہیں کہ ناپیں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے علم کو! جو یہ کہے گا کہ حضرت محمد ﷺ کا علم لامتناہی ہے' اور اللہ ہی کے علم کی طرح کامل اور کُل ہے وہ مشرک ہے۔ لیکن جو اِس کو اپنے تئیں ناپ تول کر بتائے گا کہ آپ ﷺ کا علم اتنا ہے تو وہ خدائی کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اگر کوئی محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے علم کا حدود اربعہ خود معین کرنے بیٹھ گیا ہے تو یہ بھی کم درجے کی گمراہی نہیں ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ آپ ﷺ کے پاس جو علم بھی تھا اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ تھا۔ انہیں جتنا دکھایا اللہ تعالیٰ نے دکھایا' جو بتایا اللہ تعالیٰ نے بتایا۔ آپ ﷺ نے کوئی غیب کی خبر دی تو اپنی ذات سے نہیں دی بلکہ اللہ کی بتائی ہوئی دی۔ جو لوگ انبیاء کے لیے علمِ غیب کی نفی کرتے ہیں وہ غیب کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ وہ علم جو خود حاصل ہو وہ غیب ہے۔ جبکہ خود تو یہاں پر چھٹانک بھر علم بھی حاصل ہونے کا امکان نہیں ہے۔ علم تو چاہے حاضر کا ہو چاہے غیب کا ہو وہ سب اللہ ہی کا دیا ہوا ہے۔ تو اصل میں یہ علمِ غیب کی تعریف ہی کا سارا فساد ہے کہ تم نے غلط تعریف کی ہے جس کی بنا پر غیب کی نفی کر رہے ہو۔ نہ تو یہ کسی حدیث نبویؐ سے منقول ہے اور نہ ہی قرآن مجید کی کسی آیت سے منقول ہے۔ قرآن کے الفاظ تو یہ ہیں:

﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿٢٦﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ......﴾ (الجن: ۲۶'۲۷)

''وہ عالم الغیب ہے' پس وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ مگر جس کو پسند کر لے اپنے رسولوں میں سے......''

چنانچہ یہ غیب کے پردے اللہ تعالیٰ اٹھاتا ہے صرف انبیاء و رُسل کے لیے۔ البتہ کتنے اٹھاتا ہے' کتنی اس کی مشیت ہے' کس کو کتنا دکھاتا ہے' یہ وہ جانے اور اس کا رسول جانے جس نے دیکھا۔

قرآن مجید میں سورۃ النجم میں شب معراج کا ذکر ہوا ہے کہ وہاں کیا دیکھا محمد ﷺ نے' تو اس میں ایک بہت اہم نکتہ پوشیدہ ہے جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں۔ اب ذرا غور کیجیے کہ میں اور آپ کیا سمجھ سکیں گے کہ وہاں محمد ﷺ نے کیا دیکھا! اگر یہ بیان بھی کر دیا جائے تو ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آ سکتا کہ وہاں محمد ﷺ نے کیا دیکھا۔ لہٰذا قرآن مجید نے صرف یہ کہا: ﴿لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿١٨﴾﴾ ''انہوں نے دیکھا اپنے ربّ کی بڑی عظیم آیات کو''۔ سِدرَۃ المنتہیٰ پر کیا تھا' اگر قرآن اسے بیان بھی کرے تو ہماری سمجھ میں کیا آئے گا! لہٰذا صرف فرمایا گیا: ﴿اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿١٦﴾﴾ ''جب کہ ڈھانپے ہوئے تھا اُس بیری کے درخت (سِدرہ) کو جو ڈھانپے ہوئے تھا''۔ تم کیا سمجھو گے' لہٰذا تمہیں کیا بتائیں کہ کیا ڈھانپے ہوئے تھا! بس تم اسی پر قناعت کرو کہ ''دیکھا (ہمارے بندے محمد ﷺ نے) اپنے ربّ کی بڑی عظیم آیات کو''۔ اس سے آگے تمہارے حاشیۂ خیال میں آنے والی بات نہیں۔ یہ ہے معاملہ ہمارے علم اور ہماری حدود کا اور ہم اس کو لے کر ناپنے چلیں انبیاء کرام علیہم السلام کے علم کو' اور اس سے بھی آگے بڑھ کر سید الانبیاء' سید المرسلین حضرت محمد ﷺ کے علم کو' تو یہ ہماری بنیادی غلطی اور بنیادی قصور ہے۔ ہاں اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ عالم الکل ہیں' عالمُ ما کان و ما یکون ہیں تو یہ عقیدے کی خرابی اور شرک ہے۔

اب ذرا ''مَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ'' کو بھی سمجھ لیجیے کہ کہنے والا اگر اس نیت سے کہہ رہا ہے کہ آپؐ کا علم ماضی پر بھی مشتمل ہے اور مستقبل پر بھی تو وہ غلط تو نہیں! اس لیے کہ ماضی کی بھی بہت سی خبریں نبی اکرم ﷺ کو دی گئیں اور مستقبل کی بھی بہت سی خبریں آپ ﷺ کو دی گئیں۔ جب تک کہنے والا اس احاطے کے ساتھ نہ کہے کہ کُل ماضی اور کُل مستقبل کا علم آپؐ کے

پاس ہے‘ تب تک اس میں کوئی حرج اور کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ صرف دو کیٹیگریز کے اعتبار سے ہے۔ نبی اکرم ﷺ قرآن مجید کے بارے میں یہ بیان کرتے ہیں کہ ((فِیْہِ نَبَأُ مَا کَانَ قَبْلَکُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَکُمْ......)) ’’اس میں جو کچھ تم سے پہلے ہوا ہے اس کی خبریں بھی ہیں اور جو کچھ تمہارے بعد ہونے والا ہے اس کی خبریں بھی ہیں‘‘۔ تو قرآن میں اگر ماضی کی خبریں بھی ہیں اور مستقبل کے حالات کے بھی اشارے موجود ہیں تو آپ ﷺ کیا قرآن کا علم بھی نہیں رکھتے کہ انہیں معلوم نہ ہو کہ ماضی میں کیا ہوا اور مستقبل میں کیا ہوگا؟ سارے فساد کی جڑ ہے تو وہ ایک لفظ ’’کُل‘‘ ہے۔ ’’کُل‘‘ اگر ما سویٰ اللہ کے لیے آ گیا تو یہ کفر بھی ہے اور شرک بھی ہے۔ ’’کُل‘‘ کی شان تو صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی ہے۔ وہ ﴿بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ ہے ۔ ﴿عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ ہے۔ یہ ’’کُل‘‘ کا لفظ اگر آپ کسی اور کے لیے لے آئے تو وہ گویا مطلق (absolute) ہو گیا جو کہ کفر و شرک ہے‘ حالانکہ absolute ذات صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ صرف ایک لفظی نزاع اور اصطلاح کا جھگڑا ہے‘ تعریف (definition) کا ٹکراؤ ہے‘ ورنہ اس میں کوئی بنیادی اختلافی مسئلہ موجود نہیں ہے۔

خالق اور مخلوق کے ارادہ و اختیار میں فرق و تفاوت

ذرا اور آگے چلیے! ارادہ ہم بھی کرتے ہیں اور ارادہ اللہ کا بھی ہے۔ لیکن وہ ﴿فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ﴾ ہے کہ جو ارادہ کرے اسے کر گزرنے والا ہے‘ جبکہ کسی اور کی یہ شان نہیں۔ سب کے ارادے اللہ کے ارادے کے تابع ہیں۔ اللہ کا ارادہ مطلق ہے‘ کسی کے تابع نہیں‘ اسے کہیں سے sanction اور منظوری نہیں لینی۔ ایسی بات نہیں کہ صدرِ امریکہ کوئی بل پاس کرانا چاہتا ہو لیکن پارلیمنٹ منظوری نہ دے اور اس کی جان مخمصے میں پھنس جائے۔ جیسے وقت کا فرعون جو خدائی کا مدعی تھا‘ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی قرارداد (resolution) اپنے دربار میں پیش کی‘ لیکن درباری نہیں مانے تو فرعون کے ہاتھ بندھ گئے۔ یہ مطلق شان اللہ کی ہے کہ وہ جو ارادہ کرلے کر گزرنے والا ہے۔ مشیتِ مطلق صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ فرمایا گیا ہے: ﴿یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ﴾ ’’وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے‘‘۔ ﴿یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ﴾ ’’وہ جو چاہتا ہے تخلیق کرتا ہے‘‘۔ ﴿تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ﴾ ’’تو جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے‘‘۔ اسی طرح اللہ تبارک و تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ﴿اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ج﴾ (القصص:٥٦) ’’یقیناً (اے نبیؐ!) آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو چاہیں‘ لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے‘‘۔ اُس کا اختیار مطلق ہے۔ اس کا ہاتھ کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ چاہتا تو آنِ واحد میں ابوجہل کو ہدایت دے دیتا۔ ﴿یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ط﴾ (المائدۃ:١٨) ’’وہ جس کو چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے‘‘۔ اگر وہ ابوجہل کو بخشنا چاہے تو اسے معاذ اللہ کون روکے گا! اور اگر وہ کسی بڑے سے بڑے نیک آدمی کو جہنم میں جھونکنا چاہے تو اس کا اختیار مطلق ہے‘ اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ ہمارے اور اہل تشیع کے مابین عقائد میں ایک بڑا بنیادی اختلاف یہ ہے کہ ہم اللہ پر عدل واجب نہیں سمجھتے‘ جبکہ ان کے نزدیک (نعوذ باللہ) اللہ پر عدل واجب ہے۔ ان کے نزدیک مجرم کو سزا دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے اور بے گناہ کو سزا نہ دینا اس پر واجب ہے‘ جبکہ ہمارے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ وہ مالک الملک ہے‘ مختارِ مطلق ہے‘ مشیتِ مطلقہ کا حامل ہے‘ وہ بڑے سے بڑے نیکوکار کو بھی جہنم میں جھونکنے میں بااختیار ہے۔ البتہ یہ ہم جانتے ہیں کہ وہ نہیں جھونکے گا۔ امر واقع (De facto position) کوئی اور ہے‘ لیکن اس پر کوئی چیز واجب نہیں۔ اس لیے کہ جب کسی پر کوئی چیز واجب ہوگئی تو وہ مطلق شان تو نہ رہی! ہمارے نزدیک اللہ کی شان ہے ہی مطلق۔ اگر ہم اللہ پر عدل کو واجب مانیں تو وہ تو گویا ایک قانون کا پابند ہو گیا۔ حالانکہ اس کی شان تو یہ ہے کہ اس نے جو قانون خود بنائے اس کا بھی پابند نہیں‘ جب چاہے انہیں توڑ دے۔ اس نے آگ میں جلانے کا وصف رکھا ہے لیکن جب چاہے اسے سلب کرلے‘ پانی میں سطح برقرار رکھنے کا وصف رکھا ہے لیکن جب چاہے اسے سلب کرلے۔ وہ اپنے بنائے ہوئے قوانین جب چاہے توڑے‘ وہ اپنی مِلک میں جس طرح چاہے تصرف کرے‘ اس کا اختیار مطلق ہے۔ جبکہ ہمارے اختیار اور ہماری مشیت کی کیا حیثیت ہے؟ فرمایا گیا: ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ﴾ (الدھر:٣٠) اس کے دو بڑے پیارے ترجمے کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ: ’’اور تمہارے چاہے کچھ نہیں ہوگا جب تک اللہ نہ چاہے‘‘۔ لیکن یہ تو ہے نتیجہ کے اعتبار سے‘ یہ لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ محتاط ترجمانی ہے۔ دوسرا ترجمہ ہے: ’’اور تم چاہ بھی نہیں سکتے جب تک کہ اللہ نہ چاہے‘‘۔ تمہاری چاہت ہی اس کی مشیت کے تابع ہے۔ یہ ہے اصل میں اللہ تعالیٰ کی مطلق مشیت‘ کہ تمہاری مشیت بھی اس کی مشیت کے تابع ہے۔ تم چاہ ہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ نہ چاہے۔ یہ ہے اصل میں توحید کا وہ مقام کہ جہاں فنا ہو جاتا ہے انسان کا ارادہ اللہ کے ارادے میں کہ پروردگار! جو تو چاہے بس وہی ہے‘ میں کیا چیز ہوں اور میری مشیت اور ارادے کی کیا حیثیت ہے! اس میں چوٹی کی بات یہ ہے کہ سید المرسلین‘ محبوب ربّ العالمین حضرت محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی مشیت کے حوالے سے اگر دھوکہ ہو سکتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے پیش بندی کے طور پر فرما دیا:

﴿اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ج﴾ (القصص:٥٦)

’’یقیناً (اے نبیؐ!) آپ نہیں ہدایت دے سکتے جسے بھی آپ چاہیں لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے‘‘۔

اب اس تنبیہہ اور راہنمائی کے بعد کہاں شرک کا امکان باقی رہ سکتا ہے! قرآن مجید نے تو ایسے سب راستے مسدود کر دیے ہیں جن سے شرک در آ سکتا تھا۔ اور نبی اکرم ﷺ کے ساتھ یہ اندازِ تخاطب ہے ہی اس لیے کہ کہیں مغالطے کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو جائے' اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ الحمدللہ یہ اُمت بحیثیت مجموعی شرک سے بچی ہوئی ہے۔

خدا اور انسان کی حیات کا تقابل

اب آیئے حیات کی طرف۔ ہم بھی زندہ ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی زندہ ہے' لیکن ہماری زندگی اوّل تو یہ کہ اپنی نہیں بلکہ عطائی ہے۔ ع ''لائی حیات آئے' قضا لے چلی چلے''۔ دوسرے یہ کہ اس حیات کا دار و مدار اسباب پر ہے۔ کھائیں گے تو زندہ رہیں گے ورنہ مر جائیں گے' آکسیجن حاصل نہ رہے تو مر جائیں گے۔ اگر پندرہ بیس دن مسلسل جاگیں تو موت واقع ہو جائے گی۔ معلوم ہوا کہ یہ حیات بڑی ہی کمزور اور بے چاری ہے۔ یہ بڑی ہی مجبور زندگی ہے جو دوسروں کے سہارے پر قائم ہے۔ اس کے ساتھ ضعف اور احتیاج ہے' آرام اور نیند کی ضرورت ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی حیات کیا ہے؟ آیت الکرسی میں ہے: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ﴾ (البقرۃ: ۲۵۵) کہ اس کی زندگی تو وہ زندگی ہے جس میں نہ اونگھ ہے اور نہ نیند ہے۔ اس کی قوتوں میں کوئی اضمحلال پیدا نہیں ہوتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿۳۸﴾﴾ (قٓ)

''اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے مابین ہے' چھ دنوں میں پیدا کیے اور ہم پر کوئی تکان طاری نہیں ہوئی''۔

یعنی خالق کائنات کی زندگی کو اپنی زندگی کے مظاہر پر قیاس نہ کر بیٹھنا۔ اُس کی زندگی اسباب اور سہاروں کے بل پر قائم نہیں' بلکہ قائم بالذات ہے' عطائی نہیں بلکہ ذاتی ہے۔ اب ذرا سوچیے کہ ہماری زندگی کو اُس کی زندگی کے مقابلے میں زندگی کہا جا سکتا ہے؟ یہ تو صرف صورتِ حیات ہے' حیات نہیں ہے۔ حیات تو صرف اللہ کے لیے ہے۔ اسی طرح ہمارے پاس صرف صورتِ علم ہے' علم نہیں ہے۔ العلم تو صرف اللہ کے لیے ہے۔ ہمارے اندر تو صرف ارادے کی ایک صورت ہے' حقیقتاً اور مطلقاً ارادہ تو صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ ہمارے اندر مشیت کی صرف ایک جھلک سی ہے' جبکہ اصل مشیت تو اللہ کی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالیے کہ مخلوقات کی جملہ صفات کو جب صفاتِ خالق کے مقابلے میں رکھا جائے گا تو کہا جائے گا کہ یہ معدوم کے درجے میں ہیں' ان کی حقیقت کچھ نہیں ہے۔ ہمارے پاس کچھ علم ہے' لیکن اللہ کے علم کے مقابلے میں نہیں ہے۔ ہمارے اندر حیات ہے' لیکن حیاتِ خداوندی کے مقابلے میں نہیں ہے۔ اللہ کے مقابلے میں ہمیں کوئی قدرت' علم' مشیت حاصل نہیں ہے۔

میں اس اہم بحث کے لیے نبی اکرم ﷺ کے قولِ مبارک سے سند پیش کرتا ہوں۔ نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دعائے استخارہ سکھائی۔ اور اس دعا کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ہمیں یہ دعا اس طرح تلقین فرمائی جیسے قرآن مجید کی کوئی سورۃ ہو۔ دعائے استخارہ کے الفاظ ہیں: ((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُكَ بِعِلْمِكَ وَاَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَاَسْاَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِیْمِ......)) ''اے اللہ! میں تیرے علم سے خیر کی بھیک مانگتا ہوں' اور تیری قدرت سے کچھ قدرت کی بھیک مانگتا ہوں اور میں تیرے فضل عظیم سے کچھ سوال کر رہا ہوں''۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے الفاظ سورۃ القصص میں آئے ہیں: ﴿رَبِّ اِنِّيْ لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴿۲۴﴾﴾ ''اے میرے ربّ! تو جو بھی میری جھولی میں ڈال دے میں اس کا محتاج ہوں''۔ مقامِ عبدیت تو یہی ہے کہ ﴿اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ﴾ (فاطر: ۱۵) کہ تم ہر معاملے میں اللہ کے محتاج ہو۔ دعائے استخارہ کے مذکورہ بالا تین جملے مقامِ عبدیت کی وضاحت کے لیے بہت عظیم ہیں۔ اگلے دو جملے ہیں: ((فَاِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ......)) ''پس تجھے ہی قدرت حاصل ہے' مجھے کوئی قدرت نہیں' اور تو جانتا ہے مجھے کوئی علم حاصل نہیں''۔ اب اگر نبی اکرم ﷺ کے اِن الفاظِ مبارکہ کو اللہ تعالیٰ سے تقابل میں نہ رکھا جائے تو یہ نعوذ باللہ جھوٹ ہو جائے گا کہ ''مجھے کوئی قدرت اور علم حاصل نہیں'' جبکہ علم تو ہمیں بھی کچھ نہ کچھ حاصل ہے اور نبی اکرم ﷺ کا تو کہنا ہی کیا! اصل میں یہاں تقابل ہے کہ اے پروردگار! تیرے علم کے مقابلے میں میرا علم صفر ہے۔ تیری قدرت کے مقابلے میں میری قدرت صفر ہے۔ تو جب صفاتِ مخلوق کا صفاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ تقابل ہو گا تو مخلوق کی صفات معدوم کے درجے میں شمار ہوں گی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جو واقعہ سورۃ الکہف میں نقل ہوا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ جاؤ ہمارے ایک بندے کے پاس جسے ہم نے علمِ لدُنی عطا فرمایا ہے' تو قرآن مجید میں تو اگرچہ یہ تفصیل موجود نہیں ہے لیکن روایات میں آتا ہے کہ حضرت خضرؑ نے (اگرچہ ان کا نام قرآن میں نہیں ہے) حضرت موسیٰؑ سے فرمایا کہ اے موسیٰ! یہ جو کشتی کے کنارے پر آ کر چڑیا بیٹھ گئی ہے اور اس نے سمندر میں چونچ ڈال کر پانی پیا ہے تو اس پانی کو کوئی نسبت ہے اس سمندر کے پانی سے؟ تو جان لو کہ کُل مخلوقات کے علم کو اللہ کے علم کے مقابلے میں یہ نسبت بھی حاصل نہیں۔

وجودِ باری تعالیٰ اور نظریۂ وحدت الوجود

اب ذرا نظریہ ''وحدت الوجود'' کی بحث کی طرف آیئے کہ صرف اللہ کا وجود مطلق ہے' قدیم ہے اور دائم ہے' جبکہ ماسویٰ کا وجود عطائی ہے' محدود ہے' حادث اور فانی ہے۔ گویا کہ وجود تو صرف اسی کا ہے' کسی اور کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ یہ ماسویٰ سے وجود کی نفی ہے۔ یہ ''وحدت الوجود'' ہے اور درحقیقت یہ توحید فی الصفات کی بلند ترین منزل ہے۔ جو یہاں نہیں پہنچا وہ فکری سطح کے اعتبار سے توحید کی آخری منزل تک نہیں پہنچا۔ میں ذرا یہ وضاحت بھی کرتا چلوں کہ ہمارے وہ صوفیائے کرام جو اگرچہ ''وحدت الوجود'' کے قائل ہیں' لیکن انہوں نے ''وحدت الوجود'' کو ''ہمہ اوست'' (Pantheism) کے ساتھ خلط مبحث (confuse) کر دیا ہے' مثلاً ابن عربی' مولانا روم اور دیگر نامور صوفیاءاِن کے بارے میں لوگ سوءِظن میں مبتلا ہیں۔ کچھ لوگ تو انہیں بے محابا مشرک کہہ دیتے ہیں اور باقی لوگوں کی رائے بھی یہ ہے کہ وہ گمراہی کی طرف چلے گئے۔ دیکھئے نظریہ ''ہمہ اوست'' کو تو میں بھی کفر اور شرک سمجھتا ہوں۔ اب ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے فرق کو جان لیجیے! ''ہمہ اوست'' کو یوں سمجھئے کہ برف پگھل کر پانی بن گیا تو برف معدوم ہو گئی اور اب پانی ہی برف ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے تو یہ کائنات حقیقت قرار پاتی ہے اور نعوذ باللہ خدا اس میں گم ہو جاتا ہے۔ جبکہ وحدت الوجود یہ ہے کہ حقیقتِ وجود صرف خدا کے لیے ہے اور ماسویٰ کا وجود ہی نہیں ہے۔ تو ان دونوں نظریات میں زمین وآسمان کا فرق واقع ہو گیا اور یہ ایک دوسرے کی ضد ہو گئے۔ اس لیے کہ ''ہمہ اوست'' میں مخلوق حقیقت ہے اور خالق اس میں گم ہے اور ''وحدت الوجود'' میں خالق حقیقت ہے اور مخلوق کا وجود گم ہے۔ لہٰذا جب ان دونوں نظریات کو خلط مبحث کیا گیا تو بہت سے لوگوں کو مغالطہ ہو گیا۔ جب یہ confusion زیادہ ہوا تو اس میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے اصلاح کی اور انہوں نے ''وحدت الوجود'' کے بجائے ''وحدت الشہود'' کا نظریہ پیش کیا۔

وحدت الشہود یہ ہے کہ حقیقی وجود صرف اللہ کا ہے اور کائنات کا وجود اعتباری ہے اور اُس کا محض عکس ہے۔ جیسے اصل وجود درخت کا ہوتا ہے' لیکن اس کا سایہ جو زمین پر پڑ رہا ہوتا ہے وہ نظر تو آ رہا ہوتا ہے لیکن اس کا وجود کوئی نہیں ہوتا۔ ایسے ہی یہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے اظلال اور سائے ہیں اور ان کی کوئی ذاتی حقیقت نہیں ہے۔ جیسے کسی شاعر نے کہا: ؎

کُلُّ ما فی الکون وھمٌ او خیال
او عکوسٌ فی المرایا او ظلال

کہ جو کچھ اس کائنات میں ہے وہ محض وہم ہے یا خیال ہے' یا جیسے شیشے میں کوئی عکس ہوتا ہے یا سایہ۔ آپ شیشے میں نظر تو آ رہے ہوتے ہیں لیکن وہاں ہوتے نہیں ہیں۔ انہوں نے اسے ایک اور مثال سے یوں واضح کیا کہ ایک لکڑی لے کر اس کے ایک سرے پر کپڑا باندھیں اور اس کے اوپر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دیں اور اسے ایک دائرے میں تیزی کے ساتھ حرکت دیں تو دیکھنے والوں کو یہ ایک آتشیں دائرہ نظر آتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ آگ کا دائرہ نہیں ہوتا' بلکہ شعلے کی حرکت آتشیں دائرے کا روپ دھار لیتی ہے۔ اب دیکھئے اس نظریے میں کائنات اور ماسویٰ کی نفی ہو گئی اور اثبات صرف اللہ کا ہوا۔ ''وحدت الوجود'' اور ''وحدت الشہود'' میں صرف تعبیر کا فرق ہے' اور حضرت مجدد الف ثانیؒ نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے یہ فرق کیا ہے۔ یہ محض سمجھانے کا ایک لطیف سا انداز ہے۔

اس کی ایک اور بہترین تمثیل اِس دَور میں مولانا مناظر احسن گیلانی نے یہ بیان کی کہ تم ذرا تصور کر کے اپنے ذہن میں تاج محل یا مینارِ پاکستان کا نقشہ لے آؤ۔ یہ گویا تمہاری محض ایک خیالی تخلیق ہے جو تمہارے ذہن میں ہے اور تمہارے ذہن سے باہر اِس کا کوئی وجود نہیں۔ اس کے اوپر بھی تم ہو' اس کے نیچے بھی تم ہو' اس کے باہر بھی تم ہو اور اس کے اندر بھی تم ہو۔ تو یہی نسبت خالق و مخلوق کے مابین ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے بارے میں فرماتا ہے: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ (الحدید:۳) ''وہی اوّل ہے' وہی آخر ہے' وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے''۔ اور یہ کائنات محض اس کے خیال کے مانند ہے۔ ہمارا خیال تو بڑا کمزور سا خیال ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا خیال بڑا ٹھوس اور پختہ خیال ہے۔ البتہ یہ جان لیجیے کہ جس طرح ہماری ذہنی تصویر کا انحصار اور قیام ہماری توجہ پر ہوتا ہے' جیسے ہی توجہ ہٹتی ہے تصویر بھی ذہن سے محو ہو جاتی ہے' اسی طرح اس کائنات کا قیام بھی اللہ تعالیٰ کی توجہ سے ہے۔ اُس کی توجہ ہٹے تو یہ معدوم ہے۔ اسی لیے کہا گیا کہ وہ الحیّ القیّوم ہے' از خود ہے اور اس کائنات کو تھامے ہوئے ہے۔ جیسے تم اپنی توجہ کو مرتکز رکھو گے تو وہ ہیولیٰ تمہارے ذہن میں رہے گا' تم قیوم ہو اُس کے' ایسے ہی اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا القیوم ہے' اسے تھامے ہوئے ہے۔

آیت الکرسی میں صفاتِ باری تعالیٰ کے بیان کے بعد الفاظ آئے ہیں: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ اس لیے کہ مسئلۂ شفاعت کا تعلق بھی صفات والی بحث سے ہے۔

شفاعت کا مسئلہ قرآن وحدیث کی روشنی میں

اللہ تعالیٰ کے اِذن کے ساتھ شفاعت قرآن وحدیث دونوں سے ثابت ہے۔اس کا انکار کرنے والا قرآن مجید اور حدیث دونوں کی نصوص کا منکر ہو جائے گا۔آیت الکرسی میں ارشادِ الٰہی ہے:﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗۤ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ط﴾ (البقرۃ:۲۵۵) ''کون ہے جو اُس (اللہ تعالیٰ) کی جناب میں اُس کی اجازت کے بغیر شفاعت کر سکے؟'' سورۂ طٰہٰ میں فرمایا گیا:﴿یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَۃُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَہٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾﴾ ''اُس روز شفاعت کارگر نہ ہوگی' اِلّا یہ کہ کسی کو رحمان اِس کی اجازت دے اور اُس کی بات سننا پسند کرے۔'' البتہ اگر کسی کے ذہن میں شفاعت کا تصور یہ ہے کہ کوئی ہستی اتنی زور آور ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عدل کے راستے میں (معاذ اللہ) رکاوٹ بن سکتی ہے' اور اللہ سے اس کی مرضی کے خلاف کچھ کروا سکتی ہے تو یہ یقیناً شرک ہے۔اس لیے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی یہ شانِ یکتائی کہ وہ﴿عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ ہے'﴿فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ﴾ ہے'﴿یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ﴾ ہے' مجروح ہو کر رہ جاتی ہے۔پھر تو وہ (معاذ اللہ) کسی اور کی مرضی کا پابند اور کسی اور سے اِذن کا خواہاں بن کر رہ جائے گا۔پھر تو وہ اللہ نہ رہا' اس لیے کہ اس کا اختیار اور اس کی قوت محدود ہو گئی! جبکہ اللہ تو وہی ہے جس کی قوت اور اختیارات لامحدود ہیں۔

درحقیقت مشیتِ مطلقہ اور ارادۂ مطلق صرف اللہ کے لیے ہے' کسی اور کے لیے نہیں ہے۔البتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِذن پا کر شفاعت کرنا یہ یقیناً قرآن وحدیث دونوں سے ثابت ہے۔اور یہ شفاعت صرف قیامت کے دن ہی نہیں ہوگی' اب بھی ہو رہی ہے۔کوئی بھی شخص جب کسی دوسرے کے لیے کوئی دعا کرتا ہے تو وہ شفاعت ہے۔''شـفـع'' دراصل دو (۲) کو کہتے ہیں۔جیسے سورۃ الفجر میں فرمایا گیا:﴿وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ﴿۳﴾﴾ ''اور قسم ہے جفت اور طاق کی''۔تو شفاعت یہ ہے کہ آپ نے اپنی ایک درخواست کہیں پیش کی اور کسی نے آپ کے لیے سفارش بھی کی۔تو یہ سفارش دراصل شفاعت ہے کہ اُس نے اپنی بات بھی آپ کی بات کے ساتھ جوڑ دی تو بات دوہری ہوگئی۔یعنی ایک سائل ہے جو اپنا سوال پیش کر رہا ہے اور ایک اور ہے جو اُس کی سفارش کر رہا ہے۔نبی اکرمﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران بھی یہ ہوتا تھا کہ کسی مسلمان سے کسی خطا یا غلطی کا صدور ہو جاتا تو وہ خود بھی اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا تھا اور نبی اکرمﷺ کی خدمت میں بھی حاضر ہوتا تھا کہ آپؐ بھی اللہ تعالیٰ سے میرے لیے سفارش کریں۔یہ نبی اکرمﷺ کی طرف سے اللہ کی بارگاہ میں اُس مسلمان کے لیے شفاعت تھی۔اسی طرح قرآن مجید سے ثابت ہے کہ فرشتے بھی انسانوں کے لیے شفاعت کرتے رہتے ہیں۔ازروئے الفاظِ قرآنی:﴿یَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ﴾ (الشوریٰ:۵) ''وہ زمین والوں کے لیے (اپنے پروردگار سے) استغفار کرتے رہتے ہیں۔'' اسی طرح کا معاملہ میدانِ حشر میں ہوگا۔انبیاء' صدیقین' شہداء' صالحین اور اولیاء اللہ کو اپنے اپنے مراتب کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملے گی کہ وہ بھی گنہگاروں کے حق میں شفاعت کریں۔البتہ اللہ تعالیٰ کے اِذن کے بغیر کوئی ہستی بھی کسی کے لیے شفاعت نہیں کر سکے گی۔ارشادِ الٰہی ہے:﴿لَا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾﴾ (النبا) ''(اُس روز) کوئی نہ بولے گا (کسی کو کلام کرنے کا یارا نہ ہوگا) سوائے اُس کے جسے رحمٰن اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے۔'' تو شفاعت کا مطلق انکار قرآن مجید اور احادیثِ نبویہؐ کی نصوص کا انکار ہے۔البتہ شفاعت کا جو ایک عوامی اور جاہلانہ تصور ہے کہ

خدا جنھوں پکڑے چھڑا لے محمدؐ
محمدؐ دے پکڑے چھڑا کوئی نہیں سکدا

یہ شرک کی بدترین صورت ہے۔اس میں' نعوذ باللہ' اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ایک اور مشیت غالب آ رہی ہے اور اس کے ارادے پر ایک اور ارادہ مُستولی ہو رہا ہے۔